Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ کوئی اَور ریڑا کیوں نہیں پکڑ لیتے؟"

"دو آدمی ریڑے کے پیچھے گئے ہیں بھائی۔ اب کوئی دیر نہیں۔ صبر کرو۔"

محلے دار گلی کے دروازے سے کمرے میں داخل ہُوا۔ "پُلس کو موقعہ دِکھانے سے پہلے باڈی کو اُٹھانا مناسب نہیں۔"

"پُلس کی ماں کی۔۔۔" بشیر نے گالی دی۔ "تُم ریڑے کا بندوبست کرو۔"

بشیر واپس صحن میں چلا گیا۔ محلے دار بڑبڑایا۔ "چاک سے زمین پر جسم کا خاکہ کھینچتے ہیں، تصویریں لیتے ہیں۔ وقوعے کے بارے میں سینکڑوں باتیں ہوتی ہیں۔ کیوں جی؟"

اعجاز بے عِلم سی آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھتا رہا۔ محلے دار اعجاز کی خالی خالی نظروں سے گھبرا کر پلٹ گیا۔ "تفتیش کے لِئے یہ باتیں ضروری ہوتی ہیں،" جاتے جاتے وہ بولا۔

اعجاز کو یک دم یہ احساس ہُوا کہ ابھی ریڑا آئے گا اَور کنیز کا جسم ہاتھوں میں اُٹھا کر اِسی کمرے کے رستے باہر لے جایا جائے گا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اَپنے خیال میں اُس نے یہ منظر دیکھا اَور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ باہر شام پڑ رہی تھی۔ اعجاز کِسی سے بات کئے بغیر گلی سے نِکلا اَور چل پڑا۔

شفاف آسمان پہ آدھے چاند کی روشنی پھیلی تھی۔ گرم ہوا کے جھونکے خشک کھیتوں سے گرد کے چھوٹے بڑے بگولے اُڑ رہے تھے۔ "آندھی آئے گی،" اعجاز نے بے خیالی سے سوچا۔ صبح کے وقت جب وہ جلسے کے لِئے گھر سے روانہ ہوا تھا تو اپنا بائیسکل پیچھے چھوڑ گیا تھا اَور شہر تک کا چند میل رستہ اُس نے بس پکڑ کر طے کیا تھا۔ اِس وقت واپسی پر تانگے اَور بسیں اُس کے پاس سے گزرتی جا رہی تھیں مگر اُسے سواری کا خیال تک نہ آیا تھا۔ وہ پیدل چلتا رہا۔

اعجاز نے دِن بھر سوائے پانی کے دس بارہ گلاسوں اَور چند پکوڑوں کے کچھ بھی حلق سے نہ اتارا تھا۔ دو گھنٹے پہلے علی احمد کی بیٹھک میں بیٹھے بیٹھے اُسے متلی ہونے لگی تھی اَور اسے محسوس ہوا تھا جیسے اُس کی اشتہاء ہمیشہ کے لِئے ختم ہو چکی ہے۔ اب گھر میں قدم رکھتے ہی اُسے سخت بھوک لگنی شروع ہو گئی۔ اِس کے ساتھ ہی اُسے اَپنے اَندر ایک عجیب سی کیفیت کا احساس ہُوا۔ گھر کے ماحول سے، اَور سکینہ کے وجُود سے جو نامعلوم سا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خوف اُس کے دِل میں بیٹھ گیا تھا، وہ بغیر جانے بُوجھے ہُوئے غائب ہو چُکا تھا۔ اعجاز کی کوشش ہوا کرتی تھی کہ وہ اُس وقت گھر جائے جب سب کھاپی کر فارغ ہو چُکے ہوں۔ اِس کا کھانا چُولہے کے پاس لپٹا لپٹایا پڑا ہوتا تھا جِسے وہ اکیلا بیٹھ کر کھاتا اَور پھر جا کر چارپائی پہ لیٹ جاتا تھا۔ اُس وقت سکینہ کے پاس پڑوس کی کوئی عورت آ بیٹھی ہوتی۔ گرمیوں کی راتوں میں دونوں عورتیں چارپائی پہ بیٹھی دیر تک آہستہ آہستہ باتیں کرتی رہتیں۔ اعجاز اکثر اُن کی نیچی نیچی باتوں کی آڑ میں مُنہ پھیر کر سو جایا کرتا تھا۔ آج کوئی دُوسری عورت گھر میں نہ آئی تھی۔ سکینہ اَور سرفراز کھانا کھانے کے بعد ابھی چُولہے کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ اُن کے آگے سالن کی تھالیاں پڑی تھیں جو اُنہوں نے روٹی سے پونچھ پانچھ کر صاف کر دی ہُوئی تھیں۔ اعجاز پہلے اُس چوڑی چارپائی کے پاس رُکا جِس پہ جڑواں بھائی حسن اَور حسین سو رہے تھے۔ پِھر وہ جا کر چولہے کے پاس پیڑھی پہ بیٹھ گیا۔ ذہن کے سُن ہونے نے اُس کے دِل کو بے جھجک کر دیا تھا۔ سکینہ نے اُسے اجنبی سی نظروں سے دیکھا۔

"کیا پکا ہے؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"اوجھری،" سرفراز نے جواب دیا۔

اعجاز نے حلق سے ناگوار سی آواز نکالی۔ گھر میں اُنہیں عِلم تھا کہ اعجاز کو اوجھری نہ بھاتی تھی، جبکہ سکینہ اَور سرفراز اسے شوق سے کھاتے تھے۔

"کُچھ اَور ہے؟" اعجاز نے سکینہ سے پُوچھا۔

سکینہ کی بجائے دوبارہ سرفراز نے نفی میں سَر ہلا کر جواب دیا۔ سکینہ نے ادھ جلی لکڑی سے چُولہے کی راکھ اتھل پتھل کر کے چند انگارہ کوئلے ننگے کئے اَور اُوپر لکڑی جما دی۔ پِھر اُس نے روٹیاں گرم کرنے کو دسترخوان سے توا صاف کیا۔

"رہنے دو،" اعجاز نے کہا۔ "نرم ہی ہوں گی۔ کھالُوں گا۔"

سکینہ نے خاموشی سے دوبارہ اعجاز پہ نِگاہ ڈالی۔ اُس کی پہلی نگاہ میں جہاں اجنبیت اَور ملال تھا، اب دُوسری نگاہ میں اِنکار اَور مزاحمت تھی، جیسے کہ اُسے اَپنی رنجیدگی کا حق واپس مِل گیا ہو۔ اُس نے اعجاز کی بات اَن سنی کر کے چُولہے میں پھُونک ماری تو لکڑی نے آگ پکڑلی۔ پِھر وہ لپٹی ہُوئی روٹیاں ایک ایک کر کے توے پر سینکنے لگی۔ اُس کے چہرے پہ ناگواری تھی، نظریں دُوسری جانب مُڑی تھیں، اَور اَنداز سے ظاہر تھا کہ جیسے اُس کو کِسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انجان شخص کے لِئے بیگار کرنی پڑ رہی ہو مگر ساتھ ہی اِس کے سَر کے جُھکاؤ اور ہاتھوں کی جنبش میں مکمل دھیان کی کیفیت تھی جیسے کِسی گہرے عمل میں منہمک ہو۔ اُس نے سرفراز کو سَر کا مختصر، لاتعلق سا اشارہ کرکے کہا، "اچار لے آؤ۔"

سرفراز اُٹھ کر اَندر سے اچار کا پیالہ اُٹھا لایا۔ سکینہ نے دُوسرے پیالے میں اوجھری کا سالن ڈالا اَور مُنہ دُوسری جانب پھیر کے پیالے کو اعجاز کی طرف کھسکا دیا۔ اعجاز لقمے کو بوٹیوں سے بچاتے ہُوئے، شوربے کے ساتھ اچار کی پخ لگا کر کھانے لگا۔

"لالہ! تُم اُوجھری کیوں نہیں کھاتے؟" سرفراز نے پُوچھا۔

"مُجھے پسند نہیں۔"

"پسند کیوں نہیں؟"

"کیوں کی کیا بات ہے؟ مُجھے اِس سے بُو آتی ہے۔"

"لالہ، مزے کی ہوتی ہے۔"

اعجاز بُرا سا مُنہ بنا کر کھاتا رہا۔ گاؤں کے ترکھان نے بچوں کے جوڑے کے لِئے ایک بھدی سی ریٹری بنا کردی تھی۔ سرفراز نے اَور کوئی کام نہ پاکر پاس کھڑی ہُوئی ریٹری پر دونوں ہاتھ جمائے اَور مُنہ سے چھک چھک کی آواز نکالتا ہُوا اُسے صحن میں آگے پیچھے دھکیلنے لگا۔ اعجاز بھُوک کی شدت سے چاروں کی چاروں روٹیاں کھا گیا۔ سکینہ وہیں بیٹھی مُنہ پھیر کر اپنے آپ کو پنکھا جھلتی رہی۔ سرفراز نے ریٹری کے کھیل سے اُکتا کر نلکے سے پانی پیا اور اَپنی چارپائی پہ جا لیٹا۔ کھانا ختم کرکے اعجاز نے پانی پیا، کُلّی کی اور اَپنے بستر پہ جاکر لیٹ گیا۔

"لالہ، اوجھری کیا ہوتی ہے؟" سرفراز نے سوال کیا۔

"معدہ ہوتا ہے۔"

"یہ معدے میں کیا کرتی ہے؟"

"کھانا ہضم کرتی ہے۔ اوجھری تو لیئے کی شکل کی نہیں ہوتی؟"

"ہاں!"

"اُس تو لیئے کے اَندر سے ہاضمہ کرنے والی دوائیاں نِکلتی ہیں۔"

"دوائیاں؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں۔"

سکینہ کھانے کے برتن سنبھال کر بچوں کی چارپائی پہ آلیٹی تھی۔ اعجاز کا ذہن معطل تھا مگر ایک صُورت ایسی تھی جو اُس کی آنکھوں کے پردوں پہ منعکس تھی اور ہٹتی نہ تھی، سُرخ پھُولوں والی سوزنی سے نِکلے ہُوئے دو سیاہ پیر جن کی اُنگلیوں کے ناخن زرد تھے، مختلف سمتوں میں مُڑے ہُوئے وہ پیر جو صحن کے فرش پر یُوں دُور دراز پڑے تھے کہ سوزنی کے تلے پھیلی ہُوئی ٹانگوں کا اَن دیکھا نقشہ اُبھارتے تھے۔۔۔ قینچی کے پھلوں کی سی سیاہ، پٹھے دار مضبوط ٹانگیں! اعجاز کا ذہن مفلوج اَور بدن شل تھا، مگر اُس کے تصور میں آگ لگی تھی۔ چند گھنٹے قبل اُس کے سارے جسم کے اَندر متلی کی کیفیت تھی۔ پھر غضب اَور انتقام کے جذبے نے اِس کی جگہ لے لی تھی۔ اُس کے بعد مرحلہ در مرحلہ اُس کی حالت آخر اِس اَنہونی کیفیت کو پہنچی تھی جہاں وہ چارپائی پہ لیٹا چھوٹے سے چاند کی روشنی میں ٹکٹکی باندھے سکینہ کو دیکھے جارہا تھا۔ رات گرم تھی اَور سکینہ اُس کے ساتھ والی چارپائی پہ ٹانگیں لمبی پھیلائے سیدھی پُشت پہ لیٹی تھی۔ ململ کے کُرتے میں اُس کے بدن کی گولائیاں نمایاں ہو رہی تھیں۔ اُس کے دُودھیا پیر ایک دُوسرے سے مختلف رُخ پہ ڈھلے تھے۔ اعجاز کو عِلم تھا کہ اُن انگلیوں کے ناخن گول اَور گلابی تھے۔ اگر وہ دُرست ہوش و حواس میں ہوتا تو جِس حادثے سے گزُر کر آیا تھا اُس کے بعد اَپنی خواہش کے رُخ کی اِس حیرت ناک تبدیلی سے پریشان ہو جاتا۔ مگر اِس وقت اُس کے احساسِ زیاں نے اُس کی گونگی چاہت کو ہر شے سے مُبرّا ایک ایسی زندگی عطاء کی تھی کہ وہ جاکر سکینہ کے پہلو میں لیٹ جانا چاہتا تھا۔ اُس کے دُوسری جانب سرفراز کی چارپائی تھی۔ سرفراز بے حرکت لیٹا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اعجاز نے سوچا کہ سرفراز سو چُکا ہے۔ وہ اُٹھنے کو چارپائی سے ہلا۔

"لالہ!" سرفراز بول اُٹھا۔ اعجاز چونک کر اُچھل پڑا۔

"اوئے نامراد، سوتے سوتے دِل ہلا دیتے ہو، کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں،" سرفراز نے ڈر کے جواب دیا۔

"بولو بولو، کیا بات ہے؟" اعجاز نے سختی سے کہا۔

"مجھے اوجھری سے بُو نہیں آتی۔"

"خُدا کی مار اوجھری پر، اِس کا پیچھا بھی چھوڑے گا یا نہیں؟ سوجا، سویرے تُو نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سکُول نہیں جانا؟"

"لالہ چار چھٹیاں ہو گئی ہیں۔"

"ساری رات جاگنے کی چھٹیاں تو نہیں ہو ئیں۔"

"لالہ، میں نے آج سویرے بتایا تھا۔"

"کیا بتایا تھا؟"

"کہ چار چھٹیاں ہیں۔"

"بتایا ہو گا۔ چل اب سو جا۔"

"تیرا لالہ ہوش میں ہو تو کوئی بات یاد رکھے،" سکینہ مُنہ پرے کیے کیے بولی۔

سکینہ کی اِس پہل سے اعجاز کو عِلم ہوا کہ گو سکینہ کا چہرہ دُوسرے رُخ پہ رہا تھا، مگر اُس عورت کے بدن میں اعجاز کی نظروں کی خبر مسلسل رہی تھی۔

آخر جب چھٹی ساتویں کا چاند ڈھلتا ڈھلتا گھر کی منڈیروں کو آلگا اَور آسمان پہ روشنی بجھ سی گئی تو اعجاز نے لیٹے لیٹے سَر موڑ کر سرفراز کے سونے کی آواز پہ کان لگائے۔ سرفراز کی سانس گہری اَور ہموار چل رہی تھی۔ اعجاز اُٹھ کر سکینہ کی چارپائی کے برابر جا کھڑا ہُوا۔ اَندھیرے میں اُسے دِکھائی نہ دیا کہ وہ سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی۔ اعجاز نے جھُک کر دیکھا۔ سکینہ کا چہرہ دُوسری جانب کو مُڑا تھا اَور اُس کی آنکھیں کھُلی تھیں۔ اعجاز نے ایک بازو اُس کی کمر کے نیچے اَور دُوسرا گھٹنوں تلے داخل کیا اَور ہَولے سے اُسے پرے کھسکا دیا۔ سکینہ کے بدن نے ہلکی سی مزاحمت کی، جِس سے اُس کا وزن معمول سے بھاری اُٹھا۔ اعجاز اُس کے برابر لیٹ گیا۔ اُس کے لیٹتے ہی سکینہ نے پہلو بدلا اَور اعجاز کی جانب پُشت کر دی۔ چند مِنٹ اِنتظار کرنے کے بعد اعجاز نے ایک ہاتھ سکینہ کے پہلو پہ رکھ دیا۔ سکینہ کی جلد میں مہین سی جھرجھری پیدا ہُوئی اَور رُک گئی۔ دیر تک دونوں بے حرکت لیٹے رہے۔ پِھر نہایت آہستہ آہستہ، جیسے خُون کی حدت سے بدن میں قوت آتی ہے، سکینہ کے بدن میں معمولی سا اکڑاؤ پیدا ہُوا، مگر اُس نے اپنی پُشت نہ بدلی۔ اب نیند اعجاز کے سَر کو اِس طرح چڑھی جیسے زمین کے کِسی کونے سے کالی آندھی اُٹھ کر دیکھتے ہی دیکھتے جہان پہ چھا جاتی ہے۔ گرم آسمان پہ ایک نیزی کی ترسی ہُوئی چیخوں کی آواز نے اچانک معصوم بچوں کو خواب میں چونکا دیا۔ سکینہ نے اُنہیں تھپکنا شُروع کر دیا۔ اعجاز کو ابھی اِس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بات کا فہم نہیں تھا مگر خواب میں جانے سے پہلے اِس کے بدن میں ایک دُور کا عِلم تھا کہ اِس ایک شام میں اُس پر سے ایک واردات کا گزُر نکمل ہو چُکا تھا۔ وہ سکینہ کی کمر کے نشیب میں ہاتھ رکھے رکھے سو گیا۔

صبح سکینہ نے رات کی باسی روٹی پہ چٹکی بھر نمک چھڑکا اَور گھی میں تل کر اُسے چائے کی پیالی کے ساتھ اعجاز کے آگے رکھا تو سکینہ کا رنگ نکھرا ہوا، آنکھیں چمک دار اَور جِسم بھرا بھرا باثمرِ دِکھائی دے رہا تھا۔ مگر اعجاز کے دِل میں، رات کا پہاڑ گزُرنے کے بعد بھی پہلے روز کی کسک باقی تھی۔ اُسے ایک احساس تھا کہ وقت کِسی طور ہاتھ سے نِکلا جاتا ہے۔ اُس نے حسن کو گود میں لِئے لِئے ناشتہ کیا۔ روٹی ختم کر کے اُس نے دو گھونٹ چائے ختم کی اَور اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"میں ابھی آتا ہُوں،" اُس نے سکینہ سے کہا۔ سکینہ اُسے بے تاب سی سوالیہ نظروں سے باہر جاتے ہُوئے دیکھتی رہی۔

"لالہ، میں بھی چلوں؟" سرفراز نے اُچک کر پُوچھا۔

"اونہوں۔ تُم بی بی کے پاس رہو۔" یہ کہہ کر اعجاز دروازے سے باہر نِکل گیا۔

شہر میں علی احمد کی گلی ویران پڑی تھی۔ یقین نہ آتا تھا کہ صِرف سولہ گھنٹے پیشتر یہاں پہ ایک طوفان کھڑا تھا۔ اعجاز نے تیسری بار دروازہ کھٹکھٹایا تو اَندر سے علی احمد کا نوعمر بھتیجا نِکلا۔ اعجاز علی احمد کے بارے میں دریافت کر رہا تھا کہ پٹ کے پیچھے سے علی احمد کی بیوی کی آواز آئی۔ اُس نے اعجاز کے سلام کا جواب دے کر بتایا کہ اُس کا خاوند ابھی ہسپتال میں ہے۔ اعجاز نے کنیز کے بارے میں پُوچھا تو علی احمد کی بیوی ایک لحظے کو ہچکچائی، پھر بولی، "وہ بھی اُدھر ہی ہے۔" اعجاز سائیکل پہ سوار ہو کر ہسپتال کو چل دیا۔

علی احمد کی داہنی ٹانگ پر ٹخنے سے لے کر آدھی ران تک پلستر لگا تھا۔ ہسپتال کی آہنی چارپائی کے فریم سے ایک رسی لٹک رہی تھی جِس کے سِرے سے بندھی ٹانگ بستر سے اُوپر چھت کی جانب اُٹھی تھی۔ علی احمد پُشت پہ سیدھا لیٹا تھا۔ اُس کے چہرے پہ جگہ جگہ پٹیاں چپکی تھیں۔ اعجاز کے مُنہ سے علیک سلیک کے الفاظ ادا نہ ہو سکے۔ کئی لمحوں تک دونوں گنگ نظروں سے ایک دُوسرے کو دیکھتے رہے۔ اعجاز نے تاسف سے سَر ہلایا اَور علی احمد کی چارپائی کے کنارے پر بیٹھ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میرا کیا گیا ہے چوہدری،" پھر علی احمد درد سے بولا، "دو چار ہڈیاں ہی ٹوٹی ہیں، جڑ جائیں گی،" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اُس کے الفاظ ہوا میں اٹکے رہے۔ "میرا کیا گیا ہے چوہدری،--- میرا کیا گیا ہے،" اُس نے ہولے سے دُہرایا۔

اعجاز خاموش بیٹھا رہا۔ اُسے ہمّت نہ ہوئی کہ کوئی اَور بات کرے---- آخر کچھ دیر کے بعد اُس نے پُوچھا۔ "پولیس میں رپورٹ کرائی؟"

"کیا فائیدہ؟" علی احمد نے نفی میں سر ہلایا۔ "ڈاکٹر بھی کہتا ہے رپورٹ کرو، محلے دار بھی کہتے ہیں رپورٹ کرو۔ مَیں کہتا ہُوں پُلس کوئی اُن کو پکڑ لے گی؟ اُن کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔ پُلس اُلٹا مجھ سے پیسے کھائے گی۔ میری تو درخواست اِتنی ہے کہ چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں۔ بس شکر کروں گا۔" علی احمد کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"کنیز،---" اعجاز توقف سے بولا، "اس کا کیس تو سیدھا ہے، ڈاکٹری رپورٹ---"

"گواہی کون دے گا؟" علی احمد بات کاٹ کر بول،۔ "میرے گھر کی عورتیں؟ ناں چوہدری۔ ہم غریب لوگ ہیں، مگر عِزّت دار ہیں۔ میرے دادا نے یہ گھر بنایا تھا۔ میرا باپ اِسی گھر میں پیدا ہُوا، مَیں نے بھی یہیں جنم لیا۔ محلے میں سب سے تعلق واسطہ ہے۔ مردوں کے لِئے جِسم پر سوٹے کھانا کوئی بے عِزّتی نہیں، مگر گھر کی عورت کو عدالت کا مُنہ دِکھانا مر مٹنے والی بات ہے۔" علی احمد رُکا، "لڑکی کی بات تو وَیسے بھی ختم ہو گئی۔"

"ختم ہو گئی؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"وہ گئی۔"

"گئی؟" اعجاز کا مُنہ کھُل گیا۔ "کہاں گئی؟"

"کوئی خبر نہیں۔ ڈاکٹروں نے ٹیکے لگائے، دیکھ بھال کی، شام کو گولیاں دے کر سلا دیا۔ ابھی میرے بھائی نے آکر بتایا ہے کہ راتوں رات اُٹھ کر بشیر کے ساتھ نِکل گئی ہے۔ بشیر کے گھر والوں کو بھی عِلم نہیں کہ کہاں گیا ہے۔"

اعجاز خاموش بیٹھا علی احمد کا مُنہ دیکھتا رہا۔ "کہاں جا سکتے ہیں؟" کچھ دیر کے بعد اُس نے پُوچھا، مگر یُوں کہ جیسے ساری دُنیا سے سوال کر رہا ہو اَور جواب کی توقع نہ رکھتا ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

علی احمد ہولے ہولے کراہنے لگا۔ "بشیر ذکر کیا کرتا تھا، اُدھر وہاڑی کی طرف اُس کے رشتہ داروں کو زمین الاٹ ہوئی تھی۔ ان کا بھٹہ خشت ہے۔"

"وہاڑی کے اندر؟" اعجاز نے پوچھا۔

"اونہوں۔ کسی چک میں، مجھے علم نہیں۔"

اعجاز بے خیالی سے جنرل وارڈ میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بستروں پر مریضوں کی ٹانگوں، بازوؤں اور گردنوں کے گرد پلستر ہی پلستر لگے تھے۔ مریضوں کے آس پاس اُن کے عزیز رشتہ داروں کے جمگھٹے تھے۔ زخمیوں کی تعداد اِتنی تھی کہ وارڈ سے باہر اُبلے پڑتے تھے۔ چاروں اطراف کے برآمدوں میں لوگ اپنے اپنے مریضوں کو اپنی چارپائیوں پر اور کچھ زمین پر ہی لٹائے پاس بیٹھے پنکھے جھل رہے تھے۔

"کپاس کا علاقہ ہے،" علی احمد نے کہا۔

"کیا؟"

"وہاڑی۔ بورے والا،" وہ بولا۔ "سارا چھٹی کا علاقہ ہے۔"

"ہاں!" اعجاز آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھتا رہا۔

"جب چھٹی کھلتی ہے تو ایسا دِکھائی دیتا ہے جیسے کھیتوں میں اولے اٹکے ہوں۔"

اعجاز اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے سرسری رخصت لی اور سائیکل پر سوار ہو کر چل پڑا۔

بڑی سڑک پر سائیکل چلاتا ہوا اعجاز بے خیالی میں شجاع آباد کا راستہ کاٹ کر گزر گیا۔ اُس کے جسم میں اِتنی قوت تھی کہ کوسوں کوس پیڈل مارتا ہوا اُڑتا چلا جا رہا تھا، گویا کسی مقابلے کی دوڑ میں شریک ہو۔ جب کئی میل پر جا کر رُکا تو سر سے پیر تک پسینے میں نہایا گیا تھا۔ اُس کے ذہن میں ایک ایسے شہر کا نقشہ جما تھا جسے اُس نے دیکھ بھی نہ رکھا تھا۔ وہ وہاڑی کبھی نہ گیا تھا۔

دُھوپ کی تیزی سے اُس کا چہرہ جل رہا تھا اور سینے کے اندر دم ٹوٹ چکا تھا۔ اُس نے سائیکل ایک ٹاہلی کے سائے میں کھڑی کر دی۔ سڑک کے دونوں جانب کھیت تھے اور دُور ایک گاؤں کی مٹیالی دیواریں دُھوپ میں چمک رہی تھیں۔ اعجاز درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ کھلی فضاء اور کڑکتی دُھوپوں کی مخلوق تھا، مگر اِس وقت اُس کے اعضاء میں ناتوانی یوں در آئی تھی جیسے اُن کے اندر کوئی شئے رئیسہ تلف ہو چکی ہو۔ اب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دُھوپ اُس کی آنکھوں میں ٹیس پیدا کرنے لگی تھی۔ اُس نے اپنا سَر درخت کے تنے سے ٹیک کر آنکھیں بند کرلیں۔ آہستہ آہستہ اُس کی آنکھوں کے عقب میں پردیس کے نام اَور مقام تحلیل ہونے لگے۔ اُس کا دِل ٹھہرنے لگا۔ ایک انجانی سڑک پر سائیکل کی دیوانی دَوڑ گویا اَپنے جذبوں پہ اُس کی آخری یُورش تھی۔ سایہ دار درخت تلے بیٹھے بیٹھے، بند آنکھوں کے اَندر ہی اَندر، اعجاز کے دِل سے ایک زمانہ گزُر گیا۔ جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو سورج سَر سے ڈھلنے لگا تھا۔ وہ سہارا لے کر اُٹھا اَور تھکے ہُوئے پیروں سے سائیکل کا پیڈل گھماتا ہُوا واپسی کے رستے پر ہولیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حِصّہ چہارم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باب 7

"جیبیں خالی کر دو،" احمد شاہ بولا۔ "چل گامے، تُو پہلے کر۔"

غلام حسین نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ریزگاری نکالی اَور میز پہ پھیلا دی۔ "کُل ایک روپیہ۔"

"سلیمے،" احمد شاہ نے حکم دیا۔

سلیم نے جیب سے سکے نکالے اَور مُٹھی پہ ہی گن کر میز پر ڈھیر کر دیئے۔

"ایک روپیہ دو آنے۔"

احمد شاہ نے مُنہ سے بولے بغیر اُبرو اُٹھا کر سرفراز کی جانب دیکھا۔ سرفراز نے پیسے جیب سے نکالے اَور گن کر میز پہ رکھ دیئے۔

"سرفرازے،" احمد شاہ دھمکا کر بولا۔ "واپس جیب میں کیا ڈال رہا ہے؟"

"اٹھنی ہے۔" سرفراز نے کہا۔

"اس کا قلفہ کھائے گا؟ چل نکال۔"

"اونہوں،" سرفراز نے اُٹھنی جیب میں رکھ لی۔ "کرایہ ہے۔"

"کیسا کرایہ؟"

"کل واپس گھر نہیں جانا؟"

"تُو بس کا کرایہ دیتا ہے؟"

"ہاں۔"

احمد شاہ نے سَر پیٹ لیا۔ "اوئے تو پینڈو کا پینڈو ہی رہا۔ کرایہ کون دیتا ہے؟"

"تین روپے دس آنے ہو گئے،" سلیم نے سارے سکے میز پہ اکٹھے کرتے ہُوئے کہا، "تیرے پاس کتنے ہیں، شاہ؟"

"احمد شاہ نے ہاتھ قمیض کی بغل والی جیب میں داخل کیا۔ جب نکالا تو اُلٹی جیب اَندر سے نِکلتی ہُوئی آئی۔ اُس کی اُنگلیوں میں چند سکے تھے۔ "میرے پاس تو یہی کچھ ہے۔" اُس نے سکے سلیم کی ہتھیلی پہ رکھ دیئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بارہ آنے؟" سلیم نے پُوچھا۔

"دیکھ لو،" احمد شاہ اُلٹی جیب کا کپڑا، جِس کی سلائی میل کی وجہ سے سیاہ ہو چکی تھی، ہاتھ سے پھٹک کر دکھاتے ہُوئے بولا۔ "ساڑھے چار تھوڑے ہیَں؟"

"پیٹ بھی نہیں بھرے گا،" غلام حسین نے مُردہ سے لہجے میں کہا۔

"مَیں نے کہا تھا آج فیشن ہو گا،" احمد شاہ مکا ہُوا میں لہرا کر بولا، "تو ساڑھے چار میں فیشن ہی ہو گا۔"

"کیسے ہو گا؟"

"میرے اُوپر چھوڑ دو، بس چلے آؤ۔"

لڑکوں نے چارپائیوں سے ہلنے میں توقف کیا، وہیں بیٹھے بیٹھے کمرے کے نیم اَندھیرے میں دیکھتے رہے۔ پھر اُنہوں نے جھُک جھُک کر زمین پر نظریں دوڑائیں جیسے جُوتوں کی تلاش میں ہوں گو جُوتے سامنے ہی رکھے تھے۔ اُس کے بعد وہ اُٹھے اَور موم بتی کی رَوشنی میں احتیاط سے چلتے ہُوئے دیوار تک گئے، جہاں ایک کے بعد دُوسرے نے چھوٹے سے شیشے کے سامنے ست روی سے بالوں میں کنگھی کی۔ صِرف غلام حسین، جِس کے سَر پہ لوہے کے باریک تاروں کے سے بالوں کی ٹوپی بنی ہُوئی تھی جِس نے کبھی کنگھی کی شکل نہ دیکھی تھی، اَپنے بُوٹوں پہ جُھکا مَیلے کپڑے سے اُنہیں چمکانے کی کوشش کرتا رہا۔

"دُودھ رس منگوا کر کھا لیتے ہیَں۔" سلیم نے کہا۔

"اونہوں،" احمد شاہ نے بڑا سا سَر ہلایا۔ "کہیں بیٹھ کر کھاتے ہیَں، کل پتا نہیں کیا ہو۔"

مگر احمد شاہ کی آواز میں پہلا سا زور نہ رہا تھا۔ باقی تینوں لڑکے کمرے میں اِدھر اُدھر کھڑے تھے گویا مستقبل کی تمام تر اُمید کھو چکے ہُوں۔ چند میل کے فاصلے پر میدان کارزار گرم تھا۔ جنگ کو چھڑے ہُوئے آٹھواں روز تھا۔

بلیک آؤٹ کا سائرن آدھ گھنٹہ ہُوا بج چُکا تھا۔ اِس کے دس مِنٹ کے بعد بجلی بھی چلی گئی تھی۔ میز پر ایک ٹرانزسٹر ریڈیو بیٹری کے زور پہ چل رہا تھا جِس کی آواز ہلکی کر دی گئی تھی، مگر محاذ جنگ کی خبریں نشر کرنے والے آدمی کی آواز بھاری اَور بارُعب تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لڑکے اُس کی سنی اَن سنی کر رہے تھے جیسے سُن سُن کر اُکتا چکے ہُوں۔ سرفراز نے کھڑکی پہ لٹکے ہُوئے کونے کا پردہ سرکا کر دیکھا۔ باہر گلی میں اَندھیرا تھا۔ احمد شاہ نے پھُونک سے موم بتی بجھا دی۔ کمرے سے نِکل کر اُس نے کنڈی لگائی اَور تالا چڑھا دیا۔ چاروں لڑکے تاریکی میں سیمنٹ کی سیڑھیوں پر جما جما کر قدم رکھتے ہُوئے اُترنے لگے۔ اُن کا چوبارہ تیسری منزل پہ تھا۔ دُوسری منزل کے ایک کمرے میں اُسی کالج کے چند سینئر لڑکے رہتے تھے۔ سرفراز اَور اُس کے ساتھی جب اُن کے کمرے کے سامنے سے گزُرے تو اَندر سے اُونچی آوازیں سُنائی دیں جیسے کوئی جوش میں آکر بول رہا ہو۔ کمرے میں اَندھیرا تھا۔ ریڈیو کے ڈائل کی کمزور سی روشنی اَور جلتے ہُوئے سگریٹوں کے تین نقطوں کی لَو میں پانچ نوجوان چہروں کے دُھندلے سے خدوخال دِکھائی دے رہے تھے۔

"حرام کی مَوت ہے۔" بولنے والے کی آواز میں غصّے اَور افسوس کی ملی جلی کیفیت تھی۔

"چھوڑ یار،" دُوسرے لڑکے نے کہا، "ایسی بات نہ کر، تُو نے اَپنی ڈیوٹی ادا کر دی ہے۔ قوم پر سخت وقت آیا ہے۔ خُدا کا شکُر کر کہ بچ کر آگیا ہے۔"

"اب کوئی میرا ٹینٹوا دبا کے کہے تو پھر بھی اُدھر کا رُخ نہ کروں،" پہلے نے بات جاری رکھی۔ "وہاں کوئی پُوچھنے والا ہی نہیں۔ ہنہہ! فرشتے!"

احمد شاہ اَور اُس کے دوست آگے چل پڑے۔ کمرے میں ریڈیو کی نہائیت ہلکی آواز پس منظر میں شہید ہونے والوں کے نام گنا رہی تھی۔

"باجوہ ہے،" سلیم نے گلی میں پہنچ کر بتایا۔

"کون باجوہ؟"

"وُہی تھرڈ ایئر والا، کیمسٹری کے ڈیمانسٹریٹر کا بھائی۔"

"اِتنی تقریر کیوں کر رہا ہے؟"

"والنٹیروں میں گیا تھا۔ بڑا زِچ ہو کر آیا ہے۔"

"اچھا!" احمد شاہ نے سَر ہلا کر کہا۔ "والنٹیر بن کر گیا تھا، پھر روتا کِس لِئے ہے؟"

"کہتا ہے اُدھر کوئی پُوچھنے کچھنے والا نہیں تھا۔"

"تو کیا بینڈ باجے کے ساتھ اِن کا اِستقبال ہوتا؟ جنگ ہے، کوئی میلہ تو نہیں لگا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کہتا ہے دِن رات مزدُوروں کی طرح ایمو نیشن کے کریٹ ڈھوتے رہے اَور کِسی نے پانی تک نہ پُوچھا۔ بم دھماکوں کے اَندر سڑک پر بھُوکا پیاسا چھوڑ گئے۔"

"تمُہیں اُس نے یہ سب کچُھ بتایا ہے؟"

"دوپہر کو ہوسٹل میں عمُران کے کمرے میں بیٹھا تھا۔"

"جھوٹ بولتا ہے۔" سرفراز نے کہا۔ "ڈر کر بھاگ آیا ہے۔"

"دوپہر کو وہاں پہ تین چار اَور والنٹیر بھی تھے،" سلیم نے کہا، "وہ بھی یہی کچُھ کہہ رہے تھے۔"

"کیا کہہ رہے تھے؟"

"کہ جاتی دفعہ کہا گیا تھا کھانے پینے اَور رہنے کا بندوبست ہو گا۔"

"مَیں کہتا ہُوں ڈر کر بھاگ آئے ہیَں،" سرفراز نے جوش سے کہا۔

"چُپ کر یار!" احمد شاہ نے کہا، پِھر وہ سلیم سے مخاطب ہُوا، "اچھا، اَور کیا کہتے تھے؟"

"اِس کے علاوہ ڈیلی الاؤنس کا بھی وعدہ تھا۔ وہاں جاکر کِسی نے خیر خبر بھی نہ لی۔ لاوارثوں کی طرح سامان ڈھو ڈھو کر مر گئے، نہ روٹی نہ پانی۔"

چاروں لڑکوں پر اچانک خاموشی چھا گئی۔ گلیاں تاریک تھیں۔ ایک ٹُوٹی ہُوئی اینٹ پر سرفراز کا پاؤں اُلٹ پڑا۔ اُس کے مُنہ سے درد کی ٹیس اُٹھی تو اُس کے مُنہ سے گالی نِکلی۔ اُس کے دِل میں ایک نامعلوم سا غُصہ بل کھا رہا تھا۔ اُسے احساس ہُوا کہ کونوں کُھدروں میں چھپی ہُوئی تاریکیاں عجیب و غریب شکلیں اختیار کر کے اُسے گھور رہی ہیَں۔

"کدھر جا رہے ہو یار؟" وہ تیز لہجے مَیں بولا۔ "میں تو اِن گلیوں میں پہلے کبھی نہیں آیا۔"

"بس چلے آؤ،" احمد شاہ نے کہا، "تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا ہے۔"

"کہاں لے کر جا رہے ہو؟"

"مجُھے اِس نانبائی کی دُکان کا پتا ہے جِس کا کھانا سارے شہر میں مشہور ہے۔"

"مشہوری تو زہر کھلانے والوں کی بھی ہو جاتی ہے،" غلام حسین نے کہا۔

"نہیں۔ اِس کا کھانا کمال کا ہے، سستا اَور مزیدار۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دو چار مزید تنگ گلیوں سے گزُرنے کے بعد آخر احمد شاہ ایک چوڑی سی دُکان کے آگے رُک گیا۔ دکان کی ساری چوڑائی پر بھاری ترپال لٹک رہی تھی جس کے کناروں سے مدہم سی رَوشنی جھلک رہی تھی۔ احمد شاہ نے ایک طرف سے ترپال اُٹھائی اور چاروں لڑکے ایک دُوسرے کے پیچھے دکان میں داخل ہو گئے۔

"آؤ باؤ جی، بیٹھو۔ اوئے جیرا۔" ٹُونے ہُوئے دانتوں اور بڑھی ہُوئی داڑھی والے نانبائی نے آواز دی۔ "جا میز صاف کر۔"

احمد شاہ نے اپنے ساتھیوں کو میز پر جاکر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بے تکلفی سے دو بڑے دیگچوں کے ڈھکنے اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے نانبائی سے بات کی اور آکر چوتھی کرسی پہ بیٹھ گیا۔ دُکان کی چوڑائی ہی چوڑائی تھی، جس کے مُنہ پر ایک جانب نانبائی اپنے دیگچے، تھالیاں اور دُوسری اشیاء لِئے بیٹھا تھا، اور دُوسری طرف تنور تھا۔ پیچھے تنگ سے مستطیل فرش پر لکڑی کی چھ بے روغن میزیں اور کُرسیاں ایک دُوسری سے لگا کھاتی ہُوئی رکھی تھیں کہ معلُوم ہوتا تھا جیسے بھیڑ لگی ہے۔ صِرف دو میزوں پہ گاہک بیٹھے تھے۔ ایک پہ دو اور دُوسری کے گِرد تین، میلے میلے کپڑوں والے ادھیڑ عُمر مرد جو شباہت سے مزدُور معلُوم ہوتے تھے۔ جیرے نے میلی ٹاکی سے رگڑ رگڑ کر میز صاف کی تھی، مگر اُس کی سطح پر چکنائی کی مستقل تہہ چڑھی تھی جو کِسی طور اُتر نہ سکتی تھی۔ اِس میں سے باسی سالن کی بُو آرہی تھی۔

"گرم گرم روٹیاں لگا بئ۔" نانبائی نے دُبلے پتلے تنورچی کو، جس کے چہرے پہ دھوئیں کی سیاہ راکھ جمی تھی، ہدایت کی۔ چند مِنٹ میں جیرا چنے کی دال کی چار، پلیٹیں لے آیا۔ اُنہیں میز پہ رکھ کر وہ واپس گیا اور سالن کی چار پلیٹوں کی طشتری اُٹھائے لایا۔ سلیم نے جھُک کر اپنی پلیٹ کا معائنہ کیا۔

"یہ کیا ہے؟" اُس نے پُوچھا۔

"عینک، عینک، عینک۔" احمد شاہ اور غلام حسین نے ایک ساتھ گِردان کی۔ یہ مذاق اُس وقت سے تھا جب سلیم پہلے پہل اُن کے ساتھ شامل ہوا تھا اور اُس نے نئی نئی نظر کی عینک لگوائی تھی۔ وہ اپنی عینک اِدھر اُدھر رکھ کر بھُول جایا کرتا تھا اور ڈھونڈتے ہُوئے عینک، عینک کی رٹ لگانی شرُوع کر دیتا تھا۔ دکان میں دو لالٹینیں جل رہی تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک نانبائی کے سر پہ اور دُوسری میزوں کرسیوں والی جگہ پہ دیوار سے لٹک رہی تھی، جن سے چھوٹتی ہُوئی مٹّی کے تیل کی بُو دُکان میں پھیلی تھی۔ سلیم نے جیب سے عینک نکالی اور آنکھوں پہ اٹکا کر مدہم روشنی میں سالن کی پلیٹ کو غور سے دیکھنے لگا۔ مگر جیسے ہی وہ پلیٹ پر جُھکا، ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"آ آ آ---" وہ چہرہ چھت کی جانب اُٹھا کر اندوہناک آواز میں بولا۔ "اوجھری!"

احمد شاہ نے قہقہہ لگایا۔ "کھا کر تو دیکھ۔"

"زہر کھالُوں گا، یہ نہیں کھاؤں گا" سلیم نے کہا۔

"اوئے پینڈو، دُور دُور سے لوگ اِسے کھانے کے لِئے یہاں آتے ہیں۔"

"ہاں ہاں، پشاور سے آتے ہیں۔" غلام حسین بولا۔

"جتنے دھپے اِس کی مخالفت میں مَیں نے اپنی ماں سے کھائے ہیں تجھے پتا چلے تو رونے لگ پڑے۔"

تینوں لڑکے ہنسنے لگے۔ سلیم نے اوجھری کے سالن کی پلیٹ احمد شاہ کی طرف کھسکا دی۔

"یہ لے، تُو اسے کھا۔"

"ارے چکھ کے تو دیکھ۔"

"چکھ لیتا ہُوں، مگر پھر نہ کہنا میز پر قے کیوں کر دی ہے۔"

"چھوڑ یار،" سرفراز ناگواری سے احمد شاہ کو مخاطب کر کے بولا۔ "نہیں کھاتا تو نہ کھائے، ہمارا کیا جاتا ہے۔"

تینوں لڑکوں نے تشویش سے سرفراز کو دیکھا۔ "تجھے آج کیا تکلیف ہو رہی ہے،" غلام حسین نے کہا۔

"کھانا سامنے رکھ کر ایسی باتیں سننے کا تجھے تو بڑا مزا آ رہا ہو گا۔" سرفراز بولا۔

نانبائی کا لڑکا جیرا گرم گرم روٹیاں لے آیا۔

"چلو یار، مزا خراب نہ کرو۔ بسم اللہ کرو۔"

"مَیں آپ کو اَپنے بچپن کا ایک قِصّہ سناتا ہُوں۔" سلیم بولا۔ "یہ ہمارے قصائی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور اوجھری کی کہانی ہے۔" وہ چُپ ہو رہا۔

"بول بول، کیا کہانی ہے؟"

"مختصر کہانی ہے یعنی شارٹ سٹوری۔"

"سُنا ناء"

"وہ اوجھری سے پسینہ پونچھا کرتا تھا۔" سلیم نے کہا۔

"پھر؟"

"بس۔ یہ شارٹ سٹوری ہے۔"

کِسی نے ہنسنے کی ضرورت محسُوس نہ کی۔ سب روٹی توڑ توڑ کر کھانے میں مصروف تھے۔ دو سفید پوش قسم کے آدمی دکان میں داخل ہُوئے۔

"آؤ باؤ جی، جی آیاں نوں۔ بیٹھو،" نانبائی نے کہا۔ "او جیرے۔۔۔"

دونوں آدمی آکر ایک میز کے گِرد آمنے سامنے بیٹھ گئے اَور نانبائی کے لڑکے سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ باقی تینوں میزوں سے جبڑوں کی چپ چپ کی آواز اُٹھ رہی تھی۔

"یہ فرشتے کا کیا قِصّہ تھا؟" احمد شاہ نے کھاتے کھاتے پُوچھا۔

"کون سے فرشتے کا؟"

"باجوے نے کہا تھا۔"

"ہاں،" سلیم نے جواب دیا، "کہتا تھا ہمیں یقین سے بتایا گیا تھا کہ بموں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، دُشمن کے بم کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے۔ آسمان سے سبز کپڑوں میں ملبوس فرشتے آئیں گے اَور ہندوؤں کے بموں کو ہوا میں ہی پکڑ کر دریا میں گرا دیں گے۔ کہتا ہے وہاں نہ کوئی فرشتہ تھا نہ فرشتے کی ہوا۔ بموں اَور توپوں کے دھماکوں سے اُن کا پیشاب خُشک ہو گیا تھا۔"

احمد شاہ آہستہ سے ہنسا۔

"بھلا جیسے فرشتوں کو بم اُٹھانے کے سوا اَور کوئی کام نہیں،" غلام حسین نے کہا۔

"کیوں نہیں،" سرفراز تیزی سے بولا۔ "خُدا کی مرضی ہو تو سب کُچھ ہو سکتا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"پھر فرشتے بم پکڑنے کو کیوں نہیں آئے؟" سلیم نے پُوچھا۔

"آئے ہوں گے،" سرفراز نے کہا۔ "کیا ضروری ہے کہ دِکھائی دیں۔ اُن کو جتنے بموں کا حکم تھا وہ پکڑ لئے، باقی کے چھوڑ دیئے۔"

"تو گویا یہ فرشتوں کی خفیہ پولیس تھی، جو دِکھائی نہیں دیتے۔" سلیم بولا۔

"جو لوگ ڈر کر میدان سے بھاگ آتے ہیں اُنہیں باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں۔"

سرفراز کے تیور دیکھ کر احمد شاہ نے دونوں لڑکوں کو آنکھ کا اشارہ کیا تو سب بات چھوڑ کر کھانے پہ توجہ دینے لگے۔ اچانک بلیک آؤٹ کے خاتمے کا سائرن بج اُٹھا۔

"آہا آآ---" لڑکوں کی میز سے خُوشی کا نعرہ بلند ہُوا۔

"اوئے جیرا،" نانبائی نے مختصر سی تالی بجا کر آواز دی۔ "پردہ اُٹھا دے۔"

جیرے اَور تندورچی نے دونوں بازو پہ لٹکتی ہُوئی رسیاں پکڑ کر کھینچیں تو پردہ دُہرا ہو کر اُٹھتا چلا گیا۔

"چاچا، ترپال پر بڑا خرچہ آیا ہوگا" سفید پوشوں میں سے ایک نے نوالہ چباتے ہُوئے کہا۔

"نئیں باؤ جی، یہ تو پندرہ سال پہلے کی ہے۔ رمضان شریف کے مہینے کے لِئے لی تھی۔ اب بلیک آؤٹ کے کام بھی آجاتی ہے۔"

"چاچا، برف تو کچھ اَور بھیج۔" احمد شاہ نے پانی کے آہنی جگ کو ہاتھ سے محسوس کر کے کہا۔

"برف تو ختم ہے باؤ جی، برف خانے والوں نے کوٹہ آدھا کر دیا ہے۔ اِس جنگ نے سارا نظام خراب کر دیا ہُوا ہے۔ اللہ ہندستان کا بیڑا غرق کرے۔"

چاروں نے پلیٹیں صاف کر کے پانی کے گلاس چڑھائے اَور اطمینان سے ڈکار لیئے۔ احمد شاہ اَور غلام حسین نے اَپنے اَپنے سگریٹ سلگائے۔ وہ بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے کہ برقی رَو پلٹ آئی۔ اَب اُن کی میز سے دوبارہ فتح کا نعرہ بلند ہُوا۔

"آہاہاہا---"

دُکان چھوڑنے سے پہلے احمد شاہ نے کھانے کے پیسے ادا کئے۔ گلی میں نِکل کر سلیم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے پُوچھا۔ "کتنا بل بنا؟"

"سچ بولُوں یا جھوٹ۔"

"سچ۔"

"یار سچ ہمیشہ نقصان دیتا ہے مگر خیر، جنگ کا زمانہ ہے، جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔ دو روپے دس آنے۔"

"کس حساب سے؟"

"چار چار آنے کی دال، چھ چھ آنے کی اوجھری، دوّنی مَیں نے جیرے کو دی ہے۔ ہمیشہ دیتا ہُوں۔"

"اَور روٹیاں؟"

"روٹیاں مفت۔"

"ہیں؟ روٹیاں مفت، اِسی لِئے بھاجی کے پیسے زیادہ لیتا ہے۔"

"باقی پیسے نکالو۔"

"کون سے باقی پیسے؟"

"پونے دو روپے۔"

"وہ میری کمیشن۔"

"اوئے، کمیشن کا لگتا۔" سرفراز بولا۔

"وہ میری سگریٹ کی ڈبی کے پیسے۔"

احمد شاہ کی بات ختم ہونے سے پہلے تینوں لڑکے اُس پہ ٹُوٹ پڑے۔ اُس نے لڑکوں کی گرفت سے نِکل بھاگنے کی کوشش کی مگر لڑکوں نے اُسے گھیر کر دبوچ لیا۔ احمد شاہ نے اَپنی قمیض کی جیب کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپا اَور پاؤں کے بل زمین پہ بیٹھ کر سَر کو کہنیوں اَور گھٹنوں کے بیچ چُھپا لیا۔ اُوپر سے تینوں لڑکے اُس کی کلائیاں کھینچ کھینچ کر جیب اِس کے ہاتھوں سے چھُڑانے کی کوشش کرنے لگے۔ پِھر غلام حسین نے اُس کی کمر کو بازوؤں کے حلقے میں کسا اَور گھسیٹ کر اُسے زمین پہ لٹانا چاہا مگر احمد شاہ جو ہر ایک کو طنزیہ طور پہ پینڈو کے لقب سے پُکارتا تھا، خود ایک خالص اَور تنومند کِسان تھا۔ جسمانی طور پہ وہ اَپنے تینوں ساتھیوں سے زیادہ زور آور تھا۔ اسی لِئے جب کالج کے پہلے سال میں اُن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چاروں کی آپس میں دوستی ہُوئی تو احمد شاہ کو اَن کہے طور پہ لیڈر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ جب سال کے اختتام پہ ہوسٹل کی زندگی اَور اِس کے ضابطوں سے تنگ آئے ہُوئے لڑکوں نے مشورہ کیا تو پرائیویٹ کمرہ لے کر رہنے کی تجویز بھی احمد شاہ نے ہی پیش کی تھی۔ وہ اکثر باقیوں سے چھوٹی موٹی رقوم کی مُفت خوری کیا کرتا تھا اَور کمال سینہ زوری سے کرتا تھا، مگر اِس میں دوستی کا حق بھی شامل ہوتا تھا۔ دُوسرے بھی اُس کے حق کو قبول کرتے تھے، کیونکہ کالج کی زندگی کی چھوٹی بڑی چپقلشوں کے اَندر احمد شاہ اُن کے آگے ڈھال بن کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ اِسی وجہ سے کالج میں کوئی اُن پہ ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔

احمد شاہ نے جب اُن تینوں کا اکٹھا بوجھ اَپنے اُوپر محسُوس کیا تو پھر اُس نے اِس کھیل کو ختم کرنے کی ٹھانی۔ ایک زوردار پچھاڑ کے ساتھ وہ کُود کر اُن کے چنگل سے نِکل بھاگا۔ تینوں لڑکے بے دِلی سے اُس کے پیچھے دَوڑ پڑے۔ گلی کی نکڑ پر اُنہوں نے احمد شاہ کو جالیا۔ چند مِنٹ تک مزید دِکھاوے کی ہاتھا پائی ہُوئی، پھر سب کے سب صُورتِ حال کو تسلیم کر کے گھر کے راستے پہ چل پڑے۔ اُن کے ایف۔ اے کے اِمتحان چار ماہ پہلے ختم ہو چکے تھے، مگر نتیجہ ابھی نہ نِکلا تھا۔ پروگرام کے مطابق وہ تیسرے سال میں مشروط داخلہ لینے کے لِئے کالج آئے تھے کہ جنگ چھڑ گئی۔ روانگی کے وقت وہ کمرہ چھوڑ گئے تھے۔ خُوش قسمتی سے اُن کی واپسی پر کمرہ ابھی خالی تھا۔ کالج ایک دِن کے لئے کھُل کر غیر معین عرصے کے لِئے بند ہو چکے تھے چُنانچہ اُنہوں نے واپس اَپنے اَپنے گھروں کو جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی چاروں لڑکے جُوتوں سمیت اَپنے اَپنے بستر پہ گر پڑے۔ اِرد گِرد کے کوٹھوں پہ لوگ ہوائی جنگ کا نظارہ کرنے کی اُمید سے مایُوس ہو کر نیچے اُتر رہے تھے۔ ایک خُوش کُن شام کے اختتام پہ لڑکوں کے اعضاء میں خُوشگوار تھکن کا احساس تھا اَور دِل میں بچھڑ جانے کی ہلکی اداسی تھی۔ احمد شاہ نے ہاتھ بڑھا کر ریڈیو کا بیٹری والا بٹن نکالا اَور بجلی والا دبا دیا۔ قومی ترانے بج رہے تھے۔

"یار اِس کو بند کرو،" غلام حسین نے کَروٹ لے کر کہا، "نیند آئی ہے۔"

"ناں!" سرفراز نے کہا، "ابھی نُور جہاں آئے گی۔"

"نُور جہاں کو سُن سُن کر ابھی تیرا شوق پُورا نہیں ہوا؟ میرے تو کان پک گئے ہیں۔